سیاسیات اسلام کے نظریئے

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ

علم کلام وہ فن ہے جس میں اصول دین کی حمایت کی جائے اور معترض ان پر جو شکوک وشبہات وارد کریں ان کو دفع کیا جائے، لیکن کسی چیز کی حمایت وحفاظت ہر زمانہ میں ایک ہی طور سے نہیں کی جاسکتی، کیونکہ ہر زمانہ کے خیالات یکساں نہیں ہوتے۔ اس تغیر آباد عالم میں کسی چیز کو قرار نہیں، ہر وقت خیالات بدلتے رہتے ہیں، حسن وقبح کا انسانی معیار بدلتا رہتا ہے، چیزوں کی قدر و قیمت کا معیار بدلتا رہتا ہے، لیکن دین جو حق مطلق اور صداقت کا دائمی ہے وہ ناقابل تغیر ہے، توحید، انبیاء، عالم غیب، احکام الٰہی، آغاز عالم سے ان کے حقائق یکساں ہیں اور یکساں رہیں گے۔ اسی طرح معاملات کی صداقت اور اخلاق کی طہارت کا معیار ہمیشہ سے ایک ہی ہے اور ایک ہی رہے گا، قتل ناحق اور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر تصرف میں لانا جس کے انواع چوری، ڈاکہ، غصب، خیانت، رشوت وغیرہ ہیں، ہمیشہ ممنوع رہے ہیں اور رہیں گے، جھوٹ کا بُرا اور سچ کا اچھا ہونا نہ کبھی بدلا ہے اور نہ کبھی بدلے گا۔

اوپر کی سطروں کا خلاصہ یہ ہے کہ دین ایک غیر متبدل حقیقت ہے اور انسانی خیالات کا سیلاب ہمیشہ چڑھتا اترتا رہتا ہے۔ ایک ہی چیز جو کبھی اعتراض کا مورد تھی، دوسرے وقت میں مستحسن سمجھی جانے لگتی ہے اور جو کبھی مستحسن تھی، وہ دوسرے وقت میں قابل اعتراض بن جاتی ہے۔

غرض ان غیر متغیر دینی حقائق اور ان تغیر پذیر انسانی خیالات میں ایک کشاکش سی قائم رہتی ہے۔ علم کلام کا کام یہ ہے کہ اس کشاکش کو دور کرے لیکن اس کشاکش کو دور کرنے کا طریقہ بھی یکساں نہیں رہ سکتا، کیونکہ زمانہ کے خیالات اور ہر کوشش کرنے والے کی دماغی ساخت، ذہنی فعلیت اور طریق فکر یکساں نہیں ہوتا، اس لئے زمانہ کے تغیر اور ہر صاحب فکر کے طریق فکر کے اختلاف سے اس کشاکش اور تصادم کے رفع کرنے کا طریق بھی بدلتا رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ کا علم کلام دوسرے زمانہ کے علم کلام سے الگ رہا ہے، کیونکہ حملوں کی نوعیت کے بدلنے سے ان کی مدافعت کی نوعیت بھی بدلتی ضرور ہے۔

کبھی آسمان کے خرق والتیام، جزء لا یتجزیٰ، استطاعت مع الفعل وقبل الفعل، اور الواحد لا یصدر عنہ الا واحد، کے مسائل نفیا یا اثباتاً علم کلام کے اجزاء تھے، کبھی معجزات کا صدور نبوت کے ثبوت کا معیار تھا، کبھی قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت اس کی حقانیت کا آئینہ تھی، کبھی ان صداقتوں کے ثبوت کے دوسرے معیار پیدا ہوگئے، چنانچہ کبھی خرقِ عادت کی کثرت کسی دین کے ثبوت کا ذریعہ تھی اور کبھی خرقِ عادت کی سرے سے نفی دین کی صداقت کا معیار بنی۔ غرض کبھی ذہنی یونانی فلسفیانہ خیالات کی عینک سے دین کو دیکھا گیا، کبھی اشراقی صوفیانہ نظر کی کسوٹی پر اس کو کسا گیا۔ کبھی منافع دنیاوی اور شواہد عقلی کی ترازو سے ان کو تولا گیا اور آج یورپ کے افکار وخیالات سے ان کو جانچا جارہا ہے۔

اسی جدید عہد کے متکلمین کی کوششوں پر ایک نظر ڈالئے جو سید احمد خاں اور مفتی عبدہٗ کے زمانہ سے آج کے دن تک میدانِ عمل میں آئے تو معلوم ہوگا کہ ہر وقفہ کا علم کلام دوسرے وقفہ سے الگ ہوتا رہا۔ سید صاحب اور مفتی عبدہٗ کا عہد وہ تھا جب سائنس کی ترقیوں نے مادیت کا زور پیدا کیا اور فطرت اور نیچر اور قواعد طبعی اور نیچرل لاز (قوانین) صداقت کا معیار بن گئے۔ معجزات کی نفی کی گئی، یعنی ان کی تاویل کی گئی، جنت ودوزخ اور عقائد مابعد الطبعی کی باطنی تشریح کی گئی اور اسلام کا نام فطرۃ الٰہیہ ایسے معنوں میں رکھا گیا جن معنوں میں نیچر کا لفظ بولا جاتا ہے۔

اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب فطرت اور نیچر کے بجائے تمدن، تہذیب، طرز سلطنت اور رفاہِ عام کے طور وطریق ایک دین کی صداقت اور معیاری ہونے کے دلائل ٹھہرائے گئے، یہ وہی زمانہ ہے جب الفاروق لکھی گئی، الجزیہ لکھا گیا۔ حقوق الذمیین ترتیب پائے، اسلامی شفاخانے اور اسلامی کتب خانے وغیرہ مضامین اشرفیوں سے تولے گئے۔

اب گزشتہ جنگ عظیم نے جب کروٹ لی تو خیالات کی دنیا میں بھی تزلزل آیا، سیاسیات کے رنگ بدلے اور انسانی حقوق کے نئے نقشے ترتیب پائے، پھر سوشلزم کی کامیاب وحدت نے جب روس کے تخت پر قبضہ کیا تو اقتصادیات کے نئے نئے عقائد لوگوں میں پھیلے اور دینی حقائق کے معیار میں بھی ایک نئی تبدیلی آگئی۔

صرف پہلے ساٹھ ستر برس کے سیاسی تغیرات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ متکلمین اسلام نے کیا کیا پہلو بدلے، سرسید تک کی تحریروں میں شخصیت پرستی کا زور تھا اور شخصی سلطنت ہی خیر وبرکت کا موجب رہی، سید جمال الدین افغانی نے لکھا کہ اسلام کی خیر شخصیت عادلہ میں ہے، اسی پچھلے زمانہ کے ایک بڑے عالم باعمل کی تحریروں میں شخصی بادشاہی کو عین منتہائے اسلام ہونے کی تلقین بکثرت ملتی ہے۔

لیکن ان دماغوں نے جو ابتدائے عہد جدید میں بیدار ہوئے، دستوری حکومت کو منشائے اسلام قرار دیا، اور پھر جمہوریت کا دور آیا، جس میں اسلامی حکومت کو جمہوریہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ ابھی اسی جنگ میں جب جرمنی میں ہٹلر اور اٹلی میں مسولینی کا عروج تھا اور بہ ظاہر یہ نظر آتا تھا کہ فسزم اس معرکہ میں کامیاب ہوکر نکلے گا، طبائع میں میلان پیدا ہوگیا کہ حکومت اسلامیہ کو ڈکٹیٹرشپ اور فسزم کے رنگ میں پیش کیا جائے، اب فسزم اور ڈکٹیٹرشپ کی ناکامی کے

بعد پھر سوشلزم کا زور ابھرنے لگا ہے، اور اب موجودہ وقت وہ ہے جس کا علم کلام اسلام اور سوشلزم کے درمیان توفیق اور تطبیق ہے، بلکہ یہ ہے کہ سوشلزم کے مقابلہ میں اسلامی اصول سیاست واقتصاد کی برتری ثابت کی جائے۔

تحدیث نعمت کے طور پر عرض ہے کہ آج تو اس موضوع پر لکھنے والے بہت سے اہل علم ہیں لیکن ہندوستان میں سب سے پہلے راقم الحروف کو اس کی توفیق ملی، غالباً ۱۹۱۰ء میں ''اسلام اور اشتراکیت'' کے عنوان سے ایک مفصل مضمون الندوہ میں سپرد قلم کیا، پھر اسی مضمون کو الہلال کلکتہ کی ادارت میں شمول ے بعد ۱۹۱۲ء میں ''التحریۃ فی الاسلام'' کے عنوان سے از سر نو لکھا، جو الہلال کے کئی نمبروں میں شائع ہوا، اس وقت تک اشتراکیت صرف تخیل اور نظریہ تھا، اس نے کوئی عملی صورت اختیار نہیں کی تھی، اس کی عملی صورت تو ۱۹۱۸ء سے ظاہر ہوئی، جب جنگ عظیم کے خاتمہ کے قریب روس نے بالشویک انقلاب کو کامیاب کیا۔

روسی بالشویکوں کی کامیابی نے بہت سی قوموں کے افکار میں ہیجان پیدا کر دیا اور خصوصیت کے ساتھ محکوم قوموں کے نوجوانوں کے دل ودماغ میں ایسی شور انگیزی پیدا کر دی ہے کہ سوشلزم ان کا مذہب اور مارکس اور اینجل کی تصانیف ان کا دینی صحیفہ بن گیا ہے اور ان کے اندر اس کی اشاعت اور کامیابی کے لئے وہی جدوجہد اور ایثار وقربانی کی روح پیدا کر دی ہے جو کبھی ''مذہبی مجنونوں'' کا خاصہ تھا۔

سوشلزم کی تحریک اگر صرف سیاسی واقتصادی اصلاح طلبی کی چیز ہوتی تو مسلمانوں کو چنداں اس سے اختلاف نہ ہوتا، مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ اس کی تہہ میں لادینی دعوت کام کر رہی ہے، وہ ''قیصر'' اور ''خدا'' دونوں کو ایک ساتھ تخت اور عرش سے اتار کر اور قیصر کے محل اور خدا تعالیٰ کے معبد دونوں کو برابر ڈھانا چاہتی ہے اور بقول اقبال یہ وہ دین ہے جس کا کلمہ لا الہ اور لا ملک ہے، اور اسلام کا کلمہ لا الہ الا اللہ اور لاملک الا اللہ ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ سوشلزم ایک تخریبی تحریک اور اسلام ایک تعمیری دعوت ہے، لیکن ایک حیثیت سے یہ مسئلہ کلام کے علمی ونظری تنگنائے سے نکل کر عملی زندگی کا معاملہ بن گیا ہے۔

یہ ایک افسوس ناک حقیت ہے، مگر حقیقت ہے کہ اسلامی دعوت کی وسعت جو انسانی زندگی کے ہر گوشہ تک وسیع تھی، مگر وہ گھٹتے گھٹتے صرف چند عقائد اور چند عبادات تک محدود ہو کر رہ گئی، بنی امیہ نے اپنے عمل سے سیاست کو دین سے خارج کر دیا اور عباسیہ نے تہذیب وتمدن وآداب کو بھی دین کی ہمہ گیری سے الگ کر لیا۔ اس کے بعد ایرانی وترکی وتاتاری سلاطین نے قرآن کے ساتھ آئین نوشیروانی اور تورۂ چنگیزی کا اضافہ کیا۔ وہ دین تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھتے تھے، مگر ان کی سیاست اور خراج وباج کے آئین قیصر وکسریٰ اور چنگیز وہلاکو کے دستور وقواعد پر مبنی تھے، اس لئے ہماری یہ پچھلی سلطنتیں مسلمانوں کو تو ضرور تھیں مگر اسلام کی نہ تھیں، یعنی ان کے فرمانروا مسلمان تھے، مگر ان کی حکومت کا قانون اسلامی نہ تھا۔ جس طرح آج انگریزی عہد میں بھی محمڈن لا جاری ہونے سے کوئی سلطنت اسلامی نہیں ہو سکتی تھی، تو کل

صرف نکاح وطلاق ووقف وغیرہ قوانین کے اجراء سے سلطنت اسلامی نہیں ہوسکتی، الا یہ کہ اس کے استعمال میں ہم ایک نوع کا مجاز اور تساہل برتتے ہیں۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ مسلمانوں نے اس اسلامی حقیقت کی تبدیلی کو آسانی سے مان لیا، جنگ جمل، جنگ صفین، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حجاج کی لڑائی، معرکہ کربلا، واقعہ حرہ جس میں اہل مدینہ نے بنوامیہ کے خلاف لڑائی لڑی، واقعہ قراء جس میں علمائے عراق نے بنوامیہ کے خلاف معرکہ آرائی کی، واقعہ نفس زکیہ جس میں سادات وعلمائے حجاز نے مل کر عباسیہ کے خلاف پرزور بغاوت کی، یہ اور اس کے سوا دوسرے واقعات نے جن میں اصلاح وانقلاب کے علمبرداروں کو کامیابی نہیں ہوئی، خونریزی اور فتنوں کا دروازہ کھول دیا، اس لئے پچھلے متکلمین اور فقہا نے یہ اصول بنالیا کہ ہر اصلاح طلبی میں یہ دیکھنا چاہئے کہ فتنوں کے نئے دروازے تو نہیں کھلتے اور حالات بد سے بدتر تو نہیں ہوجاتے۔

ان اصلاح طلبوں اور انقلابیوں کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انقلاب سے پہلے انہوں نے انقلاب کی دعوت کا دور اپنے اوپر نہیں گزارا، اور زمین میں ہل چلانے سے پہلے زمین میں تخم ریزی شروع کردی، آخر اسی زمانہ میں ابومسلم خراسانی کی تحریک جس سے عباسیہ حکومت کا آغاز ہوا اور اسماعیلیوں کی تحریک جس سے دولت فاطمیہ پیدا ہوئی اور محمد بن تومرت کی تحریک جس سے موحدین مراکش کی سلطنت قائم ہوئی، کس طرح دعوت کی راہ سے بڑھی اور پھلی اور پھولی اور مدتوں قائم رہی۔

زمانہ کے انقلابات نے آج بہت سے امکانات پیدا کردیئے ہیں، ہر جگہ شخصی سلطنتوں کے تخت خالی ہوگئے، دستوری اور جمہوری اور عوامی سلطنتوں کے آئین پر حکومتیں قائم ہورہی ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی اصول سلطنت پر کوئی سلطنت قائم کیوں نہیں ہوسکتی، اس راہ کے جو موانع ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- مسلمان ملکوں کا بڑا حصہ نامسلمانوں کے قبضہ میں ہے، اس لئے ان مسلط قوتوں سے ٹکرائے بغیر اس میں کامیابی نہیں ہوسکتی۔

۲- مسلمان ملکوں میں جو آزاد بھی ہیں وہ نامسلمانوں کی سیاست اور مادی وذہنی برتری کے سامنے عاجز ودرماندہ ہیں، یعنی ان کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں، وہ انہیں کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور انہیں کے کانوں سے سنتے ہیں، وہ اسی کو خیر سمجھتے ہیں جس کو یورپ خیر سمجھتا ہے اور اسی کو شر جانتے ہیں جس کو یورپ شر کہتا ہے۔

۳- اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلامی سیاست وحکومت کے آئین واصول ودستور سے خود مسلمان واقف نہیں، صدیوں کی ظلمت وجہالت نے اسلام کے نور پر پردے ڈال دیئے اور قیصری وکسرائی وخاقانی دستور وآئین میں اسلامی آئین اس طرح مخفی ہوگیا ہے کہ آج ہم کو اس قیصریت وکسرانیت میں جس کو مٹانے اسلام آیا تھا، اور اسلام میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔

اسلامی حکومت وسیاست کے مؤلفین میں بڑا نام قاضی ماوردی شافعی کا ہے، وہاں بھی اصل حقیقت مستور ہے، ایک دوسرے حنبلی عالم کی کتاب بھی چھپ گئی ہے، اس میں بھی حقیقت کا پتہ نہیں، ابن خلدون کے مقدمہ میں بہت کچھ ہے، مگر ماضی کی داستان سرائی نے حال ومستقبل پر پردہ ڈال دیا ہے۔

حق یہ ہے کہ اس باب میں ہندوستان کے مصلح اعظم شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اولیت کا شرف حاصل ہے، ازالۃ الخفاعن تاریخ الخلفاء صرف علم کلام اور اور مناظرہ کی کتاب نہیں ہے، بلکہ اسلامی اصول سیاست وخلافت پر بڑی دقیق اور محققانہ کتاب ہے، لیکن مطالب دوسرے مضامین کے ساتھ متفرق اور بکھرے ہورہے ہیں، مولانا اسماعیل شہیدؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے منصب امامت میں اسلامی اور غیر اسلامی اصول وآئین حکومت کو خالص کرکے دیکھا اور مسلمانوں کی حکومتوں اور سلطنتوں کے مدارج اور مراتب مقرر کئے۔

اب جب مسلمانوں کی آنکھیں کھلی ہیں تو نظر آتا ہے کہ یورپ کے پیدا کردہ اقلیت اور اکثریت کے مسئلہ نے ایسی اہمیت پیدا کرلی ہے اور وہ دماغوں پر اس طرح مسلط ہے کہ ان ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، اپنے لئے کسی اصول وآئین کا قیام ان کو سرتاسر محال نظر آتا ہے اور جہاں وہ اکثریت میں ہیں، یورپ کے پیدا کردہ مسئلہ وطنیت نے ان کو از خود فراموش بنا رکھا ہے اور مسلمان کی زندگی ان دونوں باطل نظریوں اور عقیدوں کے نذر ہورہی ہے اور ہندوستان کی وہ اسلامی تحریک جوان دونوں سے خوددارانہ علیحدگی چاہ رہی ہے، وہ ابھی تک ایجابی کے بجائے سلبی قوت ہے اور دائمی اور پائیدار زندگی ایجابی وتعمیری قوت کے اندر مضمر ہے۔ بہرحال توقعات قائم ہیں، اصلاح کی کوششیں جاری رہیں تو ممکن ہے کہ دوسروں کی نقالی کے بجائے خود اپنے اسلاف اولین کے کارناموں پر نظر پڑے اور یونانی ورومانی قانون وطریق عدل کی جگہ کتاب وسنت اور قانون اسلام کی اتباع کا شوق پیدا ہو، لیکن اس کے لئے اصلاحی جدوجہد اور اسلامی سیاسیات پر صالح لٹریچر پھیلانے کی ضرورت ہے۔

اس موقع پر ایک واشگاف بات کہنی ضرور ہے، بعض اہل قلم اس بات کی کوشش کررہے ہیں کہ موجودہ جمہوریت کے اصول وآئین کو ایک ایک کرکے لیں اور اس کا سراغ اسلام میں لگائیں اور اسلامی شریعت کی دلیلوں سے ثابت کریں۔

دوسری طرف یہ کوشش جاری ہے کہ خلافت راشدہ کے انتخابی وانتظامی طریقوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالیں اور ان کو جامد اصول کی طرح تسلیم کرلیں، جیسا کہ ہمارے متکلمین اور فقہائے سیاست نے خلفائے اربعہ اور امیر معاویہ کے طریقہ انتخاب اور تسلط واستیلا کو ہمیشہ کے لئے دائمی اصول قرار دے لیا ہے، حالانکہ پیش آجانے والے واقعے کسی مذہب کے ایسے مقررہ اصول نہیں بن سکتے جن میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی جس طرح جہاد فرض ہے اور اس کے آلات جو عہد خلافت میں رائج تھے حملہ اور دفاع کے آلات ان میں محدود نہیں، زمانے کے حالات کے ساتھ ان میں ترقی اور تغیر ممکن ہے۔

انتخاب کے نئے آئین بن سکتے ہیں، قانون سازی اور اختلاف آراء کے مورقع پر فیصلہ کے طریقوں میں نئی راہیں

نکالی جاسکتی ہیں اجماع اور قیاس کے مدونہ اصولوں کے مطابق بہت سے نئے فیصلوں کی گنجائش ہے، مگر ضرورت ہے کہ یہ سب کچھ کتاب وسنت، قضایائے خلفائے راشدین اور مسلمات فقہائے اسلام پر اسی طرح مبنی ہوں جس طرح یورپ کے ہر قانون کی بنیاد رومن لا کے اصولوں پر ہے۔

ہم نے جہاں تک اسلام کے سیاسی اصولوں کا جو کتاب وسنت میں پھیلے ہیں، مطالعہ کیا ہے، یہ چیزیں آتی ہے کہ چند بنیادی اصول ایسے ہیں جو اسلام میں اصول کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے انحراف ممکن ہی نہیں، مثلاً یہ۔

۱.....خلیفہ کے انتخاب میں کہ وہ بہتر سے بہتر ہو، جتنی کاوش ممکن ہو کی جائے، پھر انتخاب کے بعد اس کے احکام کی جو کتاب وسنت اور مصالح مسلمین کے خلاف نہ ہوں اس کا حکم واجب الاتباع ہے۔

۲.....امور مہمہ میں جو منصوص نہ ہوں، اہل حل وعقد سے شوریٰ کیا جائے۔

۳.....بیت المال خلیفہ کی ذاتی ملک نہیں، وہ صرف مصالح مسلمین کے لئے ہے۔ اس میں ہر ناجائز تصرف خیانت ہے اور بیت المال اور اس کے اصول وقواعد اسلامی سیاست اقتصاد کے نہایت ہی اہم اصول ہیں۔

۴.....سلطنت کے نظم ونسق میں حد درجہ سادگی اور کم خرچی اختیار کی جائے۔

۵.....عہدہ دار اور اہل منصب میں ادائے فرض کے اندر پوری امانت برتی جائے ان میں سے ہر فرد اپنے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ سمجھے۔

۶.....عہدہ دارانِ سلطنت کے لئے مقررہ وظیفہ کے علاوہ رعایا سے کسی قسم کا تحفہ نذرانہ اور اخذ زر قطعاً جائز ہے۔

۷.....رعایا سے شرعی ٹیکس کے علاوہ دوسرے قسم کے غیر شرعی ٹیکس نہیں لئے جاسکتے۔ فقہ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

۸.....حکام پر پورا پورا عدل وانصاف فرض ہے، عدل وانصاف کی راہ میں رشوت، طرفداری، بے انصافی، ظلم گناہ کبیرہ ہے۔

۹.....کاشتکار اور زمیندار کے درمیان اتنا ہی تعلق ہے جتنا ایک مزدور یا اجارہ دار اور مالک کے درمیان ہے، اس کے تفصیلی احکام فقہ کی کتابوں میں ہیں۔

۱۰.....اسلامی حکومت کے اندر ہر مسلمان جو معذور نہ ہو، اس کا سپاہی ہے۔

۱۱.....غیر مسلم رعایا کی حفاظت جان ومال ومذہب کے مسلمان ذمہ دار ہیں، اور ان سے مصالحت کے وقت جو شرطیں قرار پاتی ہوں، ان کو پورا کرنا حکومت پر واجب ہے۔

۱۲.....قانون اور حدود میں ہر ادنیٰ واعلیٰ برابر ہے۔

یہ چند سرسری دفعات ہیں۔ تلاش سے ان میں کچھ اور اضافہ ہوسکتا ہے۔ ان دفعات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ

اسلامی اصول سیاست ظاہری ہیئت وشکل پر زیادہ زور نہیں دیتا اس کا اصلی زور روح اور اسپرٹ پر ہے۔ اس اصلی روح اور اسپرٹ کی بحالی کے ساتھ اگر غیر قوموں سے نظم ونسق کے کچھ قواعد لئے جائیں تو کچھ حرج نہیں، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خندق میں کھائی کھود کر حصار بنا لینے کا طریقہ اہل فارس سے حاصل کیا۔ آلات جنگ میں منجنیق کا استعمال اہل یمن سے عہد نبوی ہی میں مسلمانوں نے سیکھا، حضرت عمر کے زمانہ میں حکومت کے دفاتر کا طریق ایرانیوں اور رومیوں سے اخذ کیا۔ زمین کی پیمائش اور بندوبست ایرانی زمینداروں کے ذریعہ سے رائج کیا گیا۔ ان مثلوں سے ظاہر ہے کہ نظم ونسق حکومت کے وہ طریقے جو اسلامی روح سیاست کے منافی نہ ہوں وہ غیر قوموں سے حاصل اور نقل کئے جاسکتے ہیں، وہ آج یورپ کے ان انتظامی اصولوں اور طریقوں کو جو اسلامی اصول کے خلاف نہ ہوں قبول کیا جاسکتا ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان علماء جن کی طبیعتوں میں امنگ ہے، وہ ان مسائل پر تحقیقی مضامین لکھیں اور مسلمانوں کی نئی سیاسی زندگی کے لئے نئی راہیں کھولیں۔

☆......☆......☆

تجزیے کے مطابق سال 2001 میں امریکہ کے ''ٹوئن ٹاور'' پر دہشت گردی کی واردات تک برطانیہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد ساٹھ ہزار سے زیادہ نہیں تھی جو اس کے بعد سے ایک لاکھ سے بھی تجاوز کر چکی ہے، اس تعداد میں مزید اضافے کی توقع کی جارہی ہے۔ برطانیہ کے انٹرفیتھ تھنک ٹینک نے ''فیتھ افیئر ز'' کے عنوان سے جو تجزیہ شائع کیا ہے اس کے مطابق اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافے کی ایک بڑی وجہ ''مغربی میڈیا'' کی اسلام دشمن مہم کے خلاف ردعمل بھی ہے جو اسلام اور مسلمانوں کو بنیاد پرستی، دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خوف اور اندیشوں کی عینک سے دیکھ رہا ہے۔ فیتھ افیئر کے ڈاکٹر فیاض مغل کا کہنا ہے کہ یہ محض اندازہ ہی نہیں، برطانیہ یعنی انگلستان، ویلز اور اسکاٹ لینڈ کی مسجدوں سے حاصل ہونے والے اعداد وشمار اور مذہب اسلام قبول کرنے والی عورتوں اور مردوں سے ہونے والے انٹرویوز کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ مغربی میڈیا کے زہریلے تشہیری حملے کی زد میں آنے مذہب، اسلام کو سب سے زیادہ توجہ اور احترام کا مقام مل رہا ہے۔ اس کا کریڈٹ بہت حد تک مغربی میڈیا کو بھی جاتا ہے کہ انہوں نے انگلستان کے لوگوں کو اسلام کے اندر جھانکنے اور لوگوں کو اسلام کے خلاف زہریلی مہم کی وجہ جاننے پر اُکسایا ہے۔...... لائق توجہ اور غور طلب بات یہ ہے کہ برطانیہ کے شہری علاقوں میں جہاں ٹی وی نیٹ ورکس، ریڈیو چینلز اور اخبارات کی بھرمار ہے، اسلام کو بطور مذہب قبول کرنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

بائیں بازو کے دانشوروں کا کہنا ہے کہ خواتین کو کسی بھی معاشرے کی تباہی و بربادی کا سب سے پہلے پتہ چلتا ہے۔ برطانوی معاشرے، سرمایہ داری نظام اور بازاری معیشت کی بربادی اور تباہی کے تحت ہی برطانیہ کی خواتین اسلام کو بطور مذہب قبول کر رہی ہے۔ اسلام قبول کرنے والوں کا تناسب 63 فیصد ہے۔ ان کی اوسط عمر ساڑھے ستائیس سال بیان کی جاتی ہے جو شعور کی عمر ہے، ان کی اکثریت ''نقاب'' اوڑھنا پسند نہیں کرتی مگر حجاب استعمال کر کے اپنی الگ شناخت بنانے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔

122 انگریز خواتین سے پوچھا گیا کہ انہوں نے اسلام کیوں قبول کیا؟ اکثریت کا جواب تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ مادہ پرستی کے خلاف ہیں۔ مذہب اسلام قبول کرنے والے مردوں کی اکثریت کے خیال میں زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد ہونا چاہیے، اسلام دنیا کا جدید ترین مذہب ہے اور اس میں سماجی و معاشرتی انصاف پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ☆☆☆